بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

مئی ۱۹۶۸ء کے ترجمان القرآن میں اُن فشاری گروہوں (PRESSURE GROUPS) کا ذکر کیا گیا تھا جو اس وقت دنیائے اسلام میں دعوتِ دین اور احیائے اسلام کے راستے میں حائل ہیں۔ اِس مرتبہ ہم اُن طبقوں کی نشاندہی کرنا چاہتے ہیں جو ابتدائی مراحل میں اس تحریک کو قوت و طاقت فراہم کر سکتے ہیں۔ یہ نشاندہی ہم اس لیے ضروری سمجھتے ہیں کہ دعوت کا کام کرنے والے اس فرض کو زیادہ بہتر طریق سے سرانجام دے سکیں۔

اس بات کا متعدد بار مشاہدہ ہوا ہے کہ ہمارے بعض رفقائے کار اجتماعی نفسیات سے عدمِ واقفیت کی بنا پر ایسے حلقوں کو اپنی خصوصی توجہ کا مرکز بناتے ہیں جہاں برسوں کی محنت اور مشقت کے بعد بھی انہیں کوئی نمایاں کامیابی نصیب نہیں ہوتی اور پھر وہ دل گرفتہ ہو کر بیٹھ جاتے ہیں اور یہ غلط نتیجہ اخذ کر لیتے ہیں کہ اب یہ دعوت کامیاب ہوتی نظر نہیں آتی۔

اس سلسلے میں بحث کا آغاز کرنے سے پہلے ہم ایک بات کی وضاحت کر دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ ہمارے اِس تجزیے سے کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ ہم بعض حلقوں کو بالکل نظر انداز کرنے کے حق میں ہیں۔ اللہ کا دین بارانِ رحمت کی حیثیت رکھتا ہے جس سے ہر فرد اور گروہ کو فیض یاب ہونے کے برابر مواقع میسّر آنے چاہئیں۔ البتہ ہمیں مختلف افراد اور گروہوں کے حالات کو سامنے رکھتے ہوئے انہیں دعوت دینی چاہیے اور پھر اُن کی مخصوص نفسیاتی کیفیات کو نگاہ میں رکھتے ہوئے اُن سے توقعات وابستہ کرنی چاہییں۔ ہماری ان گذارشات کا مقصد بجز اس کے اور کوئی نہیں کہ ہمیں اپنی زیادہ تر توجہ اُن لوگوں کی طرف مبذول کرنی چاہیے جن کے دل و دماغ اس دعوت کو قبول کرنے کی بہتر صلاحیت رکھتے ہیں۔

کسی تحریک کے لیے سب سے زیادہ نکمے اور بیکار وہ لوگ ہیں جو حقیقت کو اچھی طرح جان لینے کے باوجود اپنے کسی تعصب یا ذاتی اغراض کی بنا پر اُس کی مخالفت کرتے ہیں۔ جن لوگوں نے اپنی خواہشات کو خدا بنا رکھا ہو اُن سے اس بات کی توقع رکھنا کہ وہ مفادات کی محبت میں گرفتار ہونے کے باوجود کوئی گھاٹے کا سودا کرنے پر آمادہ ہونگے بہت بڑی سادگی ہے۔ دینی تحریک کے جو کارکن ان مفاد پرست طبقوں میں کام کرتے ہیں وہ یقیناً اپنے اخلاص اور اپنی جدوجہد کے لیے اللہ کے ہاں اجر کے مستحق ہیں لیکن انہیں یہ بات پوری طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ جس زمین پر وہ محنت صرف کر رہے ہیں وہ بنجر ہے۔ کوئی شخص بیک وقت دو بندگیوں کو نباہ نہیں سکتا۔ جن لوگوں نے مفادات کی بندگی اختیار کر لی ہے وہ آخر اس بندگی کے ساتھ خدا کی بندگی کا حق کس طرح ادا کر سکتے ہیں۔ سادہ لوح عوام ان لوگوں کی زبان سے بعض اوقات اسلام اور اسلامی نظام کے متعلق تعریفی جملے سُن کر بڑے مسحور ہوتے ہیں اور ان سے بڑی مقدس آرزوئیں وابستہ کر لیتے ہیں۔ لیکن جب ان کا پورا طرزِ عمل اسلام کے خلاف پاتے ہیں تو پھر مایوسی کا اظہار کرنے لگتے ہیں۔ جو لوگ اس دنیا میں اسلامی نظام کے قیام کا عزم لے کر اٹھے ہیں انہیں اس حقیقت سے پوری طرح آگاہ ہونا چاہیے کہ مفادات کے یہ بندے اگر اسلام کے حق میں کوئی کلمۂ خیر کہتے بھی ہیں تو عالمِ واقعات میں اس کی قطعاً کوئی اہمیت نہیں۔ کسی شخص کو کسی عقیدے سے کس قدر سچی وابستگی اور لگاؤ ہے، عالمِ اسباب میں اسے ناپنے کا صرف ایک ہی پیمانہ ہے اور وہ یہ کہ وہ شخص اس کے لیے کس قدر ایثار کر سکتا ہے۔ اگر کوئی فرد یا گروہ اسلامی نظام کی برکات کا تو حسبِ ضرورت ذکر کر دیتا ہے، لیکن وہ اس کی خاطر اپنے کسی معمولی سے معمولی مفاد کو بھی قربان کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی یہ وابستگی حلق سے نیچے نہیں اتری۔ آخر یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایک فرد یا گروہ اسلام کی محبت کا دم بھی بھرتا ہو لیکن اس کی ساری وابستگیاں اور اس کی ساری دلچسپیاں ان لوگوں کے ساتھ ہوں جو اسلام کی بیخ کنی پر تلے ہوتے ہیں۔ جو شخص ان کی چیرہ دستیوں میں ان کا ساتھ بھی دے، ان کے ہر صحیح اور غلط فیصلے میں اُن کی تائید بھی کرے، اور اس کے بدلے میں اُن سے ناجائز مراعات بھی حاصل کرتا چلا جائے، اس کے بارے میں آخر عقل کس طرح باور کر سکتی ہے کہ اسے اپنے ان دنیاوی مفادات سے زیادہ بھی کوئی چیز عزیز ہے۔ آپ جب بھی کسی نظریے یا عقیدے کو اپنانے

ہیں تو لا محالہ آپ اس امر کا فیصلہ کرتے ہیں کہ جو چیزیں یا جو مفادات اس کی ضد ہیں آپ انہیں تیاگ دینے کے لیے آمادہ ہیں۔ دو متضاد نظریات یا دو متضاد عقائد، خصوصاً جب ان کے عملی تقاضے ایک دوسرے سے یکسر متصادم ہوں، آخر ان کو کس طرح بیک وقت دل و جان سے قبول کیا جا سکتا ہے۔ اسلام اگر کسی فرد یا گروہ کو عزیز ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جو مفادات اسلام کے منافی ہیں یا جو اقدار اس کی عظمت کے لیے نقصان دہ ہیں، یا جو طور طریق اس کی راہ میں مزاحم ہونے والے ہیں وہ اس قابل ہیں کہ انہیں ٹھکرا دیا جائے۔ یہ تو عین ممکن ہے کہ کوئی فرد یا گروہ اپنی بعض کمزوریوں کی بنا پر انہیں پوری طرح ٹھکرا دینے پر قادر نہ ہو یا وہ اپنے آپ میں اس ایثار کے لیے ہمت نہ پاتا ہو، لیکن اس بات کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اسلام کو نظریۂ حیات مان لینے کے باوجود زندگی کے دوسرے نظریوں سے بیزار نہ ہو۔ اُسے اسلام سے جتنی گہری محبت اور عقیدت ہوگی اُسی نسبت سے وہ اُن سے نفرت کا اظہار کرے گا۔ یہ بات کسی طرح بھی قرینِ قیاس نہیں کہ ایک شخص اسلام کی محبت کا دعویدار بھی ہو لیکن اپنے طرزِ فکر و طرزِ عمل میں کوئی معمولی تبدیلی پیدا کرنے کے لیے تیار نہ ہو ؎

نہ تم بدلے، نہ دل بدلا ۔ نہ دل کی آرزو بدلی
مَیں کیونکر اعتبارِ انقلابِ آسماں کر لوں

کلمۂ طیبہ میں اثبات سے پہلے جو نفی رکھی گئی ہے وہ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ جب تک جھوٹے خداؤں کا ابطال نہیں کیا جاتا، ان کی محبت سے دل خالی نہیں ہوتے اس وقت تک خدائے برحق کے ساتھ تعلق قائم نہیں ہو سکتا۔ نفی کا یہ حصہ غیر معمولی طور پر معنی خیز ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مَیں خدا کے اقرار سے پیشتر اس بات کا اقرار کرتا ہوں کہ اُس ایک معبودِ حقیقی کے علاوہ باقی سارے معبود باطل ہیں۔ آپ اگر انبیاء علیہم السلام کی دعوت اور اُن کی مخالفت کرنے والے افراد اور گروہوں کے طرزِ عمل کا تجزیہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ لوگ جس بات پر مشتعل ہوتے تھے وہ خدا کے وجود کا اقرار نہ تھا بلکہ اس اقرار کے ساتھ جب اس کے عملی تقاضے سامنے آتے اور یہ اقرار ان سے اس بات کا مطالبہ کرتا کہ وہ ان سارے بُتوں کی نفی کریں جن کو انہوں نے معبود بنا رکھا تھا، خواہ وہ پتھر کے بُت ہوں یا قوم و وطن کے بُت، یا نسل و رنگ کے بُت، یا مادّی

مفادات اور نفسانی خواہشات کے بت۔ تو اس وقت اُن کی طبیعتوں میں ہیجان پیدا ہوتا تھا اور وہ ان مقدس ہستیوں کو مٹانے کے درپے ہو جاتے تھے۔ ذات باری تعالیٰ کے وجود کا مجرد اقرار تو کوئی ایسی بڑی بات نہ تھی جس سے دنیا میں اتنی شدید کشمکش برپا ہوتی اور اللہ تعالیٰ کے لاتعداد بندوں کو ہر دور میں غیر معمولی مصائب کا سامنا کرنا پڑتا۔ گمراہ افراد اور باطل گروہ اقرار خدا پر اُس وقت بھڑکتے ہیں جب اس کے عملی مطالبات اور تقاضے سامنے آتے ہیں، اور وہ یہ دیکھتے ہیں کہ اس اقرار کے نتیجے میں انہیں خود کن مفادات سے دستبردار ہونا پڑے گا انہیں اپنے نظامِ فکر و عمل میں کیا تبدیلیاں کرنی پڑیں گی۔ اور انہیں اپنے معاشرتی، معاشی اور اجتماعی ڈھانچوں میں کیا تغیرات لانے پڑیں گے۔ اسی حقیقت کو قرآن مجید میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ - (عنکبوت - ۱)

کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ بس یہ کہہ دینے پر کہ ہم ایمان لائے، چھوڑ دیئے جائیں گے اور انہیں آزمائش میں نہ ڈالا جائے گا۔

اس ضمن میں یہ بھی ذہن نشین رہے کہ ہر فرد اور ہر گروہ کی آزمائش ایک طرح کی نہیں ہوتی۔ اللہ تعالےٰ کی سنت ہے کہ ایمان کے دعوے کرنے والوں کے ایمان کو جانچنے کے لیے اُن سے اس چیز کو قربان کرنے کا مطالبہ کیا جاتا ہے جو انہیں سب سے زیادہ عزیز ہو۔ کیونکہ وہ جب تک اُس کی قربانی پر آمادہ نہ ہوں اس وقت تک وہ یہ ثابت نہیں کر سکتے کہ وہ بندگیٔ رب کے دعوے میں مخلص ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی مختلف قوموں سے مختلف مطالبات کیے گئے۔ اگر ایک قوم بتوں کی پرستار تھی اور اس کا دل مٹی کی مورتیوں میں اٹکا ہوا تھا تو اُسے یہ کہا گیا کہ اللہ پر ایمان کے ثبوت میں سب سے پہلے اپنے دل کو ان کی محبت سے پاک کرو۔ اگر کوئی قوم حیلہ جو تھی اور وہ فریب کاریوں کے ذریعے اپنے مفادات پر کوئی آنچ نہ آنے دیتی تھی تو اُس سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ تم سب سے پہلے اپنی اس ذہنیت کو بدلو اور مفادات کے بُت کو اپنے ہاتھ سے پاش پاش کرو۔ اگر کسی قوم کی گھٹی میں بے حیائی پڑی ہوئی تھی اور وہ اپنی اس نفس پرستی پر جان دیتی تھی تو اُس سے دوسرے سارے تقاضوں سے پیشتر اس امر کا تقاضا کیا گیا کہ تم اس کی پرستش کو تیاگ دو، کیونکہ جب تک تم اس الٰہ کا ابطال

نہیں کرتے تم سچے خدا پر ایمان کے دعوے میں مخلص نہیں ہو سکتے۔ پھر جو قوم لین دین میں کھری نہ تھی اور مختلف نوعیت کی دھوکہ بازیوں سے ناجائز مال حاصل کرنے کی عادی تھی اُسے سب سے پہلے اس سے باز رہنے کی تلقین کی گئی۔ جس قوم نے دولت کو اپنا مقصود و مطلوب بنا رکھا تھا اُس کے لیے آزمائش یہ رکھی گئی کہ وہ سب سے پہلے اپنے دل سے اُس تیرگی کو دُور کرے جو دولت پرستی کی وجہ سے دل کی دُنیا کو تاریک کر دیتی ہے۔ کیونکہ جب تک یہ تیرگی دُور نہ ہو ایک قلب ایمان کے نُور سے کس طرح منور ہو سکتا ہے؟

جس طرح مختلف صنم خانوں میں مورتیوں اور بُتوں کی شکلیں اُن کے تراشنے اور بنانے والوں کے ذوق کے اختلاف کی وجہ سے جُدا جُدا ہوتی ہیں بالکل اسی طرح انسانوں نے بھی اپنے دل کے صنم خانوں میں جو بُت سجا رکھے ہیں اُن کی نوعیت بھی ایک سی نہیں ہوتی۔ ہر فرد کا صنم خانہ اُس کے اپنے تعصبات کے بتوں اور اپنی خواہشات اور آرزوؤں کی مورتیوں سے آباد ہوتا ہے۔ جب جبینِ نیاز خدا کی بارگاہ میں جھکنے سے احتراز کرے تو پھر کوئی ایک چوکھٹ نہیں رہتی جس پر جھک کر کوئی فرد اپنے احساسِ عبودیت کی تسکین کر سکے۔ پھر تو وہ ہزاروں چوکھٹوں پر جھکنے کے لیے بیتاب رہتی ہے۔ وہ کبھی حکمرانوں کی چوکھٹ پر جھکتی ہے کبھی قوم اور وطن اور کبھی رنگ و نسل کے بتوں کے سامنے سجدہ ریز ہوتی ہے اور کبھی مادی مفادات اور اغراض کی مورتیوں کے حضور میں اظہارِ بندگی کرتی ہے۔ جب انسان ایک خدا کی غلامی کو ترک کر دے تو پھر ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں خدا اُس سے اپنی بندگی کا مطالبہ کرنے لگتے ہیں اور وہ اُن کی غلامی اختیار کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔

اللہ پر ایمان ایک ایسا دعویٰ ہے جو فکر و عمل میں ایک بنیادی تبدیلی کا متقاضی ہے۔ اس حقیقت کو قرآن مجید میں اس طرح بیان فرمایا گیا ہے:

قُلْ اِنْ کَانَ اٰبَآؤُکُمْ وَاَبْنَآؤُکُمْ وَ اِخْوَانُکُمْ وَاَزْوَاجُکُمْ وَعَشِیْرَتُکُمْ وَ اَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ کَسَادَهَا وَمَسٰکِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَیْکُمْ

اَے نبی! کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہاری بیویاں اور تمہارے عزیز و اقارب اور تمہارے وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور تمہارے وہ کاروبار جن کے ماند پڑ جانے کا تم کو خوف ہے اور تمہارے وہ گھر جو تم کو پسند ہیں، تم کو اللہ اور اس کے رسولؐ اور

مِنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ اُس کی راہ کی جدوجہد سے عزیز ہیں تو انتظار کرو یہاں
فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ (۲۴) تک کہ اللہ اپنا فیصلہ تمہارے سامنے لے آئے۔

اس آیت میں نہایت کھلے الفاظ میں اس حقیقت کی وضاحت کی گئی ہے کہ ایمان کے کچھ بنیادی تقاضے ہیں اور ان میں سب سے اہم اور سب سے زیادہ بنیادی تقاضا یہ ہے کہ آدمی کے فکر و عمل کے سارے زاویے اور سعی و جہد کے سارے میدان بدل جائیں۔ اللہ پر ایمان جب تک اُس کے دل و دماغ میں ترجیحات کے نئے معیار اور نئے نئے پیمانے (SCALES OF PREFERENCES) نصب نہیں کرتا اُس کا ایمان اللہ کے نزدیک کبھی مقبول نہیں ہو سکتا۔ ان نئے پیمانوں کے مطابق اللہ اور اُس کے رسول کی رضا دنیا کی ہر دوسری چیز کے مقابلے میں اُس کے نزدیک وزنی ہونی چاہیے اور اُس کے حصول کے لیے تگ و دو اُس کا سب سے بڑا سرمایۂ حیات ہونا چاہیے۔ اس معیار ہی سے اُس کے اخلاص کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

قرآن مجید کے اس بنیادی اصول کو سامنے رکھتے ہوئے ہم مسلمان سوسائٹی کا جائزہ لے کر دیکھتے ہیں کہ کون کون سے عناصر دعوتِ دین کے لیے زیادہ مفید اور مؤثر ہو سکتے ہیں۔

کسی تحریک کے لیے سب سے زیادہ مفید اور کارآمد وہ لوگ ہوتے ہیں جو اُس کے لیے سب سے زیادہ ایثار کر سکتے ہیں، جو اپنی خواہشات اور اپنے مفادات کے صنم کدوں کو مسمار کرنے کے لیے تیار ہو جائیں، اور اُن کا یہ طرزِ عمل کسی وقتی و عارضی ہیجان کا نتیجہ نہ ہو بلکہ وہ خوب سوچ سمجھ کر ہر معاملے کو پوری طرح تول کر، اُس کے مختلف پہلوؤں پر ٹھنڈے دل سے غور کر کے یہ طرزِ عمل اختیار کرنے پر آمادہ ہوں۔ ہمیں سب سے زیادہ توجہ ایسے ہی سلیم الفطرت لوگوں پر صرف کرنی چاہیے۔ وقتی جوش اور ہیجان سے بسا اوقات بڑے نمایاں کام سرانجام پا جاتے ہیں، لیکن اس سے وہ تحریکیں کبھی کامیاب نہیں ہوتیں جو انسان کو بندوں کی غلامی سے نجات دلا کر خدائے واحد کی غلامی کا درس دینے کے لیے اٹھی ہوں۔ دنیا کے سارے کاموں میں سے یہ کام سب سے زیادہ مشکل، سب سے زیادہ صبر آزما اور سب سے زیادہ ایثار کا طالب ہے۔ اس بنا پر وقتی ہنگاموں کے خوگر انسان اس کے لیے قطعاً مفید اور کارآمد نہیں ہو سکتے۔ انسان کے لیے اپنی کسی ایک عادت ہی کو بدلنا بڑا مشکل ہوتا ہے، کہاں یہ بات کہ وہ اپنی زندگی کے

سارے معیارات، خوب و ناخوب کے سارے پیمانے بدل ڈالے۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ جو لوگ پورے شعور کے ساتھ اپنے مفادات کے صنم کدے اور اپنی غلط خواہشات کے بت خانے توڑ کر اس دعوت کو قبول کریں وہی پہاڑی کے چراغ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اس معاملے میں ہمیں جس چیز پر سب سے زیادہ غور کرنا چاہیے وہ یہ نہیں کہ دعوت کے قبول کرنے والے کے اندر ایک حرکت و حرارت پیدا ہو گئی ہے، یا وہ بڑھ چڑھ کر ہمارے بعض کاموں میں ہمارے ساتھ تعاون کرتا ہے، یا کبھی ہمارا مخالف تھا اور آج ہمارا ہمدرد ہے۔ بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ ان مفادات کے بارے میں اُس کا طرزِ فکر اور طرزِ عمل کہاں تک بدلا ہے جو اُسے پہلے عزیز تھے۔ کیا وہ اس دعوت کو قبول کر کے ان مفادات کو قربان کرنے پر آمادہ ہو گیا ہے جن کی وہ پہلے پرستش کرتا تھا؟ دعوت کے ساتھ مجرد ہمدردی یا تحریک اور داعیٔ تحریک کے بارے میں کوئی کلمۂ خیر زبان سے نکال دینا کوئی ایسی چیز نہیں جس پر اطمینان کا اظہار کیا جا سکے۔ اصل چیز یہ ہے کہ کسی شخص نے اُس دعوت کو کتنے خلوص کے ساتھ اپنایا ہے۔ دلوں کا راز تو خدا ہی جانتا ہے لیکن اس کو پرکھنے کا ظاہری معیار ایک ہی ہے اور وہ یہ ہے کہ جو چیزیں اس دعوت کی ضد ہیں اُن کے بارے میں اُس نے کیا روش اختیار کر رکھی ہے۔ اس بنا پر کسی تحریک کے لیے سب سے زیادہ مفید اور کار آمد وہی لوگ ہوتے ہیں جو اُس کے لیے اپنے مفادات کی زیادہ سے زیادہ قربانی دینے پر آمادہ ہوں۔

پھر مفادات کے ایثار کا نہ تو کوئی لگا بندھا ضابطہ ہے اور نہ اس کی کوئی متعین صورت ہے۔ اس کے بارے میں ہر شخص خود اپنا محاسب اور منصف ہوتا ہے۔ دلوں کے اندر جو چور چھپے ہوتے ہوں، جذبات و احساسات کی گہرائیوں میں جو مفاسد خاموشی کے ساتھ ضمیر و ایمان کے اندر نقب لگانے میں مصروف ہوں انہیں نہ تو باہر کا کوئی محتسب گرفتار کر سکتا ہے اور نہ کوئی جج انہیں سزا دے سکتا ہے۔ اندر کے ان خائنوں اور نقب زنوں کو انسان خود بھی بڑی دیدہ ریزی کے ساتھ ہی پہچاننے میں کامیاب ہوتا ہے اور پھر وہ خود ہی اس بات کا اندازہ کر سکتا ہے کہ یہ اُس کے ایمان کو کس طرح غارت کر رہے ہیں۔

بسا اوقات یہ دیکھا گیا ہے کہ ایک انسان کسی تحریک میں بڑے جوش و ولولے کے ساتھ شامل ہوتا

ہے اور اس کے لیے جدوجہد بھی کرتا ہے لیکن اپنے بنیادی مفاد کو معمولی نقصان پہنچانے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ یوں تو ان مفادات کی کئی نوعیتیں ہیں لیکن ان میں پانچ خاص طور پر بڑی اہم ہیں۔ یہاں ہم ان کا تذکرہ ضروری سمجھتے ہیں۔

مفاد کی پہلی قسم جو کسی فرد یا گروہ کے لیے زنجیر پا ثابت ہوتی ہے دنیوی مفاد ہے، اور یہ مفاد بھی کچھ ایک طرح کا نہیں ہوتا۔ اس کی ایک بڑی قسم مالی مفاد ہے جس نے بے شمار لوگوں کو اپنا اسیر بنا رکھا ہے۔ لوگ جس فرد یا گروہ یا طبقے کے ساتھ اپنا یہ مفاد وابستہ پاتے ہیں اس کی مرضی کے خلاف جنبش تک کرنے کی ہمت وہ اپنے اندر نہیں پاتے۔ دورِ جدید میں جب کہ دولت پرستی نے ایک جنون کی شکل اختیار کر لی ہے اور ہر شخص یا گروہ مال و متاع پر فریفتہ ہو رہا ہے۔ یہ مفاد غیر معمولی اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ دعوتِ اسلامی کو قبول کرنے کے معنی آج یہ ہیں کہ آدمی حکومت سے بگاڑ پیدا کرے۔ اُس کی خصوصی مراعات سے محروم ہونے کے لیے تیار ہو اور اس کے حامی طبقوں کی نظرِ عنایت سے بھی محروم ہو جائے۔ اس پر مزید یہ کہ دولت کمانے اور دولت صرف کرنے میں اخلاقی حدود کا بھی اپنے آپ کو پابند بنائے اور اس طرح آرام و آسائش اور فراوانی کی زندگی چھوڑ کر رضا کارانہ طور پر افلاس کو سینے سے لگائے۔

مالی مفاد کے علاوہ بسا اوقات اقتدار کا نشہ بھی حق بات کو قبول کرنے کی راہ میں مزاحم ہوتا ہے۔ بعض لوگوں کی فطرت میں یہ بات داخل ہوتی ہے کہ وہ اپنے ساتھیوں میں نمایاں ہوں اور انہیں اُن پر حکومت کرنے کے حقوق حاصل ہوں۔ اس مزاج کے لوگوں کے لیے کسی ایسی تحریک میں شمولیت تو درکنار اس کی تائید بھی ممکن نہیں ہوتی جو اُن کی اس خواہش اور آرزو کو پورا نہ کر سکے۔ اس لیے یہ لوگ بالعموم حکومتِ وقت کا ساتھ دیتے ہیں اور اُس کی بے پناہ قوت سے فائدہ اٹھا کر اپنی حیثیت کو اُبھارتے اور اپنے اپنے حلقوں میں غیر معمولی اثر و رسوخ پیدا کر کے اپنے اس جذبے کی تسکین کا سامان فراہم کرتے ہیں۔

بعض لوگوں کو اپنی قوم، اپنی برادری اور اپنی نسل سے بے پناہ محبت ہوتی ہے اور اس وجہ سے وہ کسی ایسے مسلک کو اپنانے کے لیے تیار نہیں ہوتے جن سے اُن کی اس محبت کو نقصان پہنچنے کا کوئی

احتمال ہو۔ ان بُتوں کو توڑنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا اور یہ کام وہی لوگ سرانجام دے سکتے ہیں جنہیں ایک طرف تو کسی تحریک سے سچی اور گہری وابستگی ہو اور دوسرے اُن کے اندر بے انتہا عزم اور حوصلہ ہو۔

پھر ان مفاد پرستوں میں ایک طبقہ وہ بھی ہوتا ہے جو اگرچہ حکومت کا ہمنوا تو نہیں ہوتا اور اُسے مالی مفادات بھی کوئی اتنے عزیز نہیں ہوتے لیکن جس حلقے سے وہ وابستہ ہوتے ہیں وہاں اُن کی قیادت و سیادت کا سکہ چلتا ہے وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ اگر وہ اپنے اس حلقے سے نکل کر کسی تحریک میں شامل ہو گئے تو وہاں اُن کی انا کی تسکین کے لیے انہیں کوئی زیادہ سامان میسر نہ ہو گا۔ اس لیے وہ ہمیشہ اس میں شمولیت سے گریز کرتے ہیں۔ اس طبقے کو ہر قدم پر مشکل یہ پیش آتی ہے کہ اس کے پیرو اسے کبھی بھی خاموش تماشائی کی حیثیت سے زندہ نہیں رہنے دیتے۔ وہ کبھی اشاروں اور کنایوں سے اور کبھی کھُل کر اُن سے نئی اُبھرنے والی تحریک کے بارے میں سوالات کرتے رہتے ہیں۔ اب اگر یہ تعریف کے چند جُملے کہہ دیں تو پھر اگلا سوال یہ ہوتا ہے کہ خود حضور کیوں اس میں شرکت نہیں فرماتے۔ اس عدم شرکت کی وجہ تو کچھ اور ہوتی ہے لیکن وہ اسے زبان پر لا نہیں سکتے اس لیے اس تحریک میں کئی قسم کے کیڑے نکالنے شروع کر دیتے ہیں اور داعیٔ تحریک کے بارے میں عجیب و غریب اور بے بنیاد باتیں گھڑ گھڑ کر اپنے ماننے والوں کو یہ باور کراتے ہیں کہ یہ ایک فتنہ ہے جو اس شخص نے کھڑا کر دیا ہے اور وہ محض للہ و فی اللہ اس کا قلع قمع کرنے میں مصروف ہیں۔ سادہ دل اور ناواقف پیرو تو ناسمجھی کی وجہ سے اس "جہاد" میں پورے خلوص کے ساتھ شریک ہوتا ہے، لیکن رہنما جان بوجھ کر اپنی قیادت و سیادت کے تحفظ کے لیے اس کام کا بیڑا اٹھاتا ہے۔

دولت پرستی، اقتدار پرستی اور انا پرستی میں الفاظ کا اختلاف تو ہے لیکن حقیقت کا کوئی اختلاف نہیں۔ اگر ایک فرد یا گروہ دولت کے لالچ میں کسی تحریک سے الگ رہتا اور اس کی مخالفت کرتا ہے تو دوسرا اپنی انا کا پجاری ہونے کی وجہ سے یہی طرزِ عمل اختیار کرتا ہے۔ بلکہ نتائج کے اعتبار سے تو دوسرے کی روش پہلے کی روش سے زیادہ تکلیف دہ ہوتی ہے۔ جو لوگ حکومت وقت کے ساتھ اپنے مخصوص مفادات کی وجہ سے وابستہ ہوتے ہیں انہیں عوام بھی اچھی طرح جانتے ہیں اور اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ یہ کس کردار کے لوگ ہیں۔ لیکن انا کے پجاریوں کا بسا اوقات دینی اور مذہبی حلقوں پر تسلط قائم

ہوتا ہے اور اُن کے بارے میں عوام نہایت اچھے جذبات رکھتے ہیں۔ اس لیے جب یہ طبقہ یورش شروع کرتا ہے تو سادہ لوح مخلوق اُن کی اس جد و جہد کو دینی فریضہ سمجھ کر ان کا ساتھ دیتی ہے۔

ایثار خواہ وہ مالی ہو یا جسمانی، بڑا قابلِ قدر ہے لیکن سب سے زیادہ قابلِ قدر انانیت کی قربانی ہے۔ جو شخص اپنی انا کو کسی مسلک پر نچھاور کر دیتا ہے وہ بلاشبہ ایک عظیم انسان ہے اور اُس کے اندر بے پناہ خلوص پایا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ شخص اپنی شخصیت کے بُت کو جو انسان کو دنیا میں سب سے زیادہ عزیز ہوتا ہے توڑ کر آیا ہے اور اُس نے صحیح معنوں میں ایک دعوت کو دل کی گہرائیوں سے قبول کیا ہے۔ آپ اگر اس ملک کے مختلف دینی حلقوں کے سربراہوں کی جماعت اسلامی سے مخاصمت کا جائزہ لیں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ ان میں اچھی خاصی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو محض انا پرستی کے جنون میں مبتلا ہو کر یہ سب کچھ کر رہے ہیں۔ یہ جن باتوں کی آڑ لے کر جماعت اور امیرِ جماعت کے خلاف ہنگامے کھڑے کر رہے ہیں اُن میں سے کوئی ایک بات بھی ایسی نہیں جو ہمارے سلف کے لٹریچر میں نہ ملتی ہو۔ خود ان کے اپنے حلقے کے بزرگوں کی تحریروں اور تقریروں کے جو ریکارڈ آج موجود ہیں اُن میں سے بے شمار ایسی باتوں کی نشاندہی کی جا سکتی ہے جو انہی موضوعات پر مولانا سیّد ابو الاعلیٰ مودودی کی باتوں سے کہیں زیادہ سخت ہیں۔ اگر اُن کی توجیہ اور تاویل میں خیر کا پہلو نکالا جا سکتا ہے تو آخر یہ سلوک اس تحریک کے داعی کے ساتھ کیوں روا نہیں رکھا جاتا۔ کیا یہ حضرات فقہ، علمِ کلام، اور تاریخ کی برسہا برس کی تعلیم و تدریس کے بعد ابھی تک اس حقیقت سے ناواقف ہیں کہ فقہی مسائل میں اختلاف یا تاریخی شواہد سے استنباط کا فرق، بشرطیکہ نیت بخیر ہو، کوئی ایسی چیز نہیں جس پر اتنی شورش برپا کی جائے۔ کم علم اور جاہل لوگ اگر اس قسم کی الزام تراشیاں کریں تو یہ کوئی ایسی تشویشناک بات نہیں، لیکن علم و فضل کے مدعیوں کو جماعت کے خلاف زبانِ طعن دراز کرنے سے پہلے اپنے دلوں میں جھانک کر دیکھنا چاہیے کہ کہیں انا پرستی کے جنون کے زیر اثر تو یہ سب کچھ نہیں کیا جا رہا۔

دنیا کے سارے محاسبوں میں سب سے زیادہ مشکل محاسبہ اپنی ذات کا ہے۔ عقل عیار ہے سو بھیس بنا لیتی ہے۔ پھر انانیت تو ایک ایسی کمزوری ہے جو اپنے حق میں دلائل کے انبار لگا دیتی ہے اور نفس کو کسی وقت بھی پریشان نہیں ہونے دیتی۔ اس بنا پر جو لوگ اپنے آپ کو دین کے معاملے میں زیادہ مخلص سمجھتے ہیں انہیں اس مرض کی طرف سب سے زیادہ توجہ دینی چاہیے۔ امام غزالیؒ نے کس قدر صحیح بات فرمائی ہے کہ انسان کو خلوص کی اُس وقت سب سے زیادہ حاجت ہوتی ہے جب اُسے اپنے خلوص پر سب سے زیادہ اعتماد ہو۔ دین کے معاملے میں للّٰہیت کا معیار یہ ہے کہ آدمی خدا کی خاطر کسی سے محبت رکھے اور خدا ہی کی خاطر کسی سے بغض رکھے۔ اور اس کے جانچنے کا معیار صرف ایک ہے کہ اگر کوئی شخص محبت اور نفرت کے معاملے میں اعتدال کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتا اور اخلاقی حدود کا لحاظ رکھتا ہے تو اس کا طرزِ عمل صحیح ہے۔ احساسِ تناسب جہاں کسی شخص کے فکری اور جذباتی توازن کو ظاہر کرتا ہے وہاں اُس کے خلوص کا اظہار بھی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ شخص کسی چیز کے غلط اور صحیح ہونے کا فیصلہ اپنی انا کے مطابق نہیں کرتا بلکہ اللہ اور اُس کے رسُول کی تعلیمات کے مطابق کرتا ہے اور ذاتی تعصبات اور رجحانات کو راہ میں حائل نہیں ہونے دیتا۔ اس قسم کے طرزِ فکر اور طرزِ عمل رکھنے والے متوازن افراد جنہوں نے اپنی انا کے بُت کو بھی پاش پاش کر دیا ہو ہر لحاظ سے قابلِ قدر ہیں اور ان کی جتنی زیادہ تعداد کسی تحریک میں شامل ہو گی اُسی نسبت سے وہ تحریک کامیاب ہو گی۔

اِن افراد کے اوصاف کی نشاندہی کرنا تو اتنا مشکل نہیں لیکن عمل کی دنیا میں انہیں تلاش کرنا بڑا مشکل کام ہے۔ اسی لیے دنیا کی ہر تحریک ایک دوسری نوعیت کے طبقے کے بل بوتے پر پروان چڑھی ہے۔ یہ طبقہ اُن افراد پر مشتمل ہوتا ہے جو اگرچہ جوہرِ قابل ہوتے ہیں لیکن معاشرے کی مروجہ اقدار انہیں ناقابلِ التفات بنا دیتی ہیں۔ ان لوگوں میں دو نمایاں صفات پائی جاتی ہیں۔ ایک سیرت کی پختگی اور دوسرے کسی طبقے کے مخصوص مفادات سے لاتعلقی۔ قرآن حکیم نے جس طبقے کو اَلْمَلَاُ کہا ہے یہ طبقہ اُس کی عین ضد ہوتا ہے۔ پہلا طبقہ اگر خوشامد کرنے میں مشہور رہتا ہے تو یہ طبقہ بڑا خوددار اور عزتِ نفس کا محافظ ہوتا ہے اور بڑی خاموشی کے ساتھ اپنی زندگی بسر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے اندر اپنے آپ کو خواہ مخواہ نمایاں کرنے کی خواہش نہیں ہوتی پھر

یہ گرد و پیش میں پھیلے ہوئے حالات پر غور بھی کرتا ہے اور معاشرے کی برائیاں دیکھ کر اپنے اندر کرب و اضطراب محسوس کرتا ہے

کسی ایسی انقلابی تحریک کے لیے جو اخلاقی اقدار کی سربلندی کا داعیہ لے کر اٹھے، اس طبقے میں سے زیادہ سے زیادہ آدمی چھانٹنے کی کوشش کرنی چاہیے، کیونکہ انہی میں سے بالآخر مطلوبہ اوصاف کے آدمی ملتے ہیں۔ اجتماعی نفسیات کے ماہرین نے مختلف طبقات کا جو تجزیہ کیا ہے وہ اسی نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ دنیا کا ہر انقلاب اسی طبقے کے بل بوتے پر آتا ہے اور تاریخ انسانی ان کے اس تجزیہ کی پوری طرح تائید کرتی ہے۔ مختلف اوقات میں جب مختلف انبیاء دین کی دعوت لے کر اٹھے تو سب سے پہلے اور سب سے زیادہ تعداد میں ان لوگوں نے ان کی دعوت پر لبیک کہا جو غریب اور مفلس تھے اور جن کا رائج الوقت نظام کے مفادات کے ساتھ کوئی تعلق نہ تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انبیاء علیہم السلام نے معاشرے میں اثر و رسوخ رکھنے والے افراد کو اپنے ساتھ شامل کرنے کی بڑی خواہش اور کوشش کی لیکن انہیں اپنے فدائی اور جاں نثار زیادہ تعداد میں اسی طبقے سے ملے اور خدا نے خود بھی اپنے انبیاء کو اسی طبقے کی طرف توجہ دلائی، اس سے وابستہ رہنے کی ہدایت کی اور اس کے مخلصین کو سینے سے لگانے کی تاکید فرمائی۔ مثلاً سورۂ کہف میں ارشاد ہوا ہے۔

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُم بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ وَلَا تَعْدُ عَيْنَاكَ عَنْهُمْ تُرِيدُ زِينَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا۔ (۲۸)

اپنے آپ کو اُن لوگوں کے ساتھ وابستہ رکھو جو اپنے پروردگار کو محض اس کی رضا جوئی کے لیے صبح شام پکارتے ہیں اور دنیوی زندگی کی رونق کی خاطر اُن سے آنکھیں نہ پھیرو۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ابتدائے جوشِ تبلیغ میں غالباً اس بات کی فکر زیادہ رہا کرتی تھی کہ روسائے قریش میں سے کوئی ایمان لے آئے تو دعوت کے فروغ اور امت کی قوت و طاقت میں نمایاں اضافہ ہو جاتے۔ آیت میں اشارہ اس جانب ہے کہ امت کا جمال و کمال اس ظاہری ساز و سامان سے نہیں بلکہ اس اخلاص سے ہے جو لوگوں کے سینوں میں موجود ہے۔ دین کے لیے یہی سب سے زیادہ قیمتی متاع ہے اور اس کی سب سے زیادہ قدر ہونی چاہیے۔ باقی رہے وہ لوگ جن کی آنکھوں کو مادی مال و اسباب کی فراوانی نے خیرہ کر رکھا ہے

جن کے دل دولت اور ثروت کی محبت سے لبریز ہوں، جن کے سر میں اقتدار کا سودا سمایا ہُوا ہو وہ بھلا ایک ایسی دعوت کو کس طرح قبول کر سکتے ہیں جو دنیا کی زندگی کو آخرت کے مقابلے میں بے وزن اور حقیر سمجھتی ہے اور اپنے ماننے والوں سے اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ اللہ کی رضا اُن کے فکر و عمل کا واحد محرک ہو۔

حضرت عیسٰی علیہ السلام نے جب یہ فرمایا کہ خوش نصیب ہیں غربا اور آسمانی بادشاہت اُن کے لیے ہے تو اُن کی مراد اسی قسم کے لوگوں سے تھی جن کی نظروں کو دنیا کی زیب و زینت نے فریفتہ نہ کر رکھا ہو۔ حضرت اُسامہؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ مَیں جنت کے دروازے پر کھڑا ہُوا اُس میں اکثر داخل ہونے والے لوگ مسکین تھے اور دولت مند روک دیے گئے۔ قرآن و حدیث، آثارِ صحابہ اور دوسرے انبیاء علیہم السّلام کی تعلیمات میں اس نوعیت کے لاتعداد اقوال اور غریبوں اور مسکینوں سے محبت کی بکثرت مثالیں ملتی ہیں لیکن یہاں ان اقوال اور اُن واقعات کو درج کرنا مقصود نہیں۔ مجھے دراصل اُس مقدس رجحان کی نشاندہی کرنی ہے جو دعوتِ دین کے علمبرداروں میں رفقا کے انتخاب کے معاملے میں ملتا ہے۔

ہم آج جس دَور سے گزر رہے ہیں، یہ مال و اسباب کی فراوانی کی وجہ سے بڑے عروج کا دَور ہے۔ آج دولت کی فی الحقیقت پرستش ہوتی ہے۔ کسی فرد کا مرتبہ و مقام اسی کے لحاظ سے مشخص کیا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ معاشرے میں سرکاری اثر و رسوخ نے بھی غیر معمولی اہمیت حاصل کر لی ہے۔ پھر خاندانی وجاہت اور قوت بھی ہماری اجتماعی زندگی پر نہایت مؤثر طریق سے اثر انداز ہو رہی ہے۔ ان سب چیزوں کے اثرات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن قرآن و سنت کی تعلیم، انسانی تاریخ اور قانونِ قدرت کے مطالعے اور مشاہدے سے اس حقیقت کو بھی جھٹلایا نہیں جا سکتا کہ یہ طبقے مؤثر ہونے کے باوجود ایک حقیقی انقلاب کے لیے اور خصوصاً دینی انقلاب کے لیے بالکل بیکار ہوتے ہیں بلکہ دعوتِ دین کی راہ کا سنگِ گراں ثابت ہوتے ہیں۔ جس طبقے کو قرآن نے الملاء کہا ہے وہ کسی مخصوص گروہ کا نام نہیں ہے بلکہ دنیا پرستوں کے اس مجموعہ کا نام ہے جو مختلف قسم کے مفادات کی بندگی میں مبتلا ہوتا ہے۔ یہ لوگ اس وقت تک دل و جان

سے کسی تحریک کا ساتھ نہیں دے سکتے جب تک انہیں مروجہ نظام کے بقا کی کچھ بھی امید باقی ہو۔ یہ اس وقت اٹھ کر آتے ہیں جب انہیں اس امر کا یقین ہو جاتا ہے کہ اب مفادات کے حصول کا راز کسی دوسرے نظام سے وابستہ ہونے ہی میں مضمر ہے۔ ان میں سلیم الفطرت انسانوں کی ایک نہایت ہی تھوڑی تعداد کسی دعوت کی صداقت کو دیکھ کر آغاز میں اسے قبول کر لیتی ہے، ورنہ اس طبقے کی اکثریت اُس وقت تک اس کی مخالفت کرتی ہے جب تک اُسے یہ بات اچھی طرح محسوس نہ ہو جائے کہ اب مروجہ نظام کا بقا کسی صورت بھی ممکن نہیں رہا اور نئی دعوت اب غالب آ کر ہی رہے گی۔

اسی اصول کے تحت دُنیا کی ہر تحریک اپنی قوت کے لیے اُن افراد اور طبقوں کی طرف رجوع کرتی ہے جو کسی رائج الوقت نظام کی نہ ہمواریوں سے پسے ہوئے ہوں اور انہی کو اپنے ساتھ ملا کر وہ آگے بڑھتی ہے۔ انقلاب کے ایک بہت بڑے مزاج شناس نے ایک بڑی حکمت کی بات کہی کہ انقلاب پاؤں پر چل کر آتا ہے اور جھونپڑوں میں پرورش پاتا ہے اور پھر ایوانوں کو متزلزل کر دیتا ہے۔ محلات میں رہنے والے نہ تو کسی نظام کے بگاڑ کو پوری طرح محسوس کر سکتے ہیں نہ اُن میں یہ ہمت اور طاقت ہوتی ہے کہ وہ اس کے خلاف کوئی عملی اقدام کر سکیں، کیونکہ ان کے مفادات اسی سے وابستہ ہوتے ہیں اور ان میں ایثار کی یہ قوت بھی نہیں ہوتی کہ اس کے بگاڑ کو وہ محسوس کر بھی لیں تو اپنے آرام و آسائش، اپنے مرتبہ و مقام اور اپنے اونچے عہدوں کو چھوڑ کر کسی انقلابی تحریک کا ساتھ دے سکیں۔ ان طبقوں کی ظاہری حالت اپنے اندر بڑی کشش رکھتی ہے اور انسان یہ سوچتا ہے کہ اگر یہ طبقے ساتھ دینے لگیں تو منزلِ مقصود بہت جلد حاصل ہو جاتے لیکن تاریخ کا یہ بھی ناقابلِ تردید فیصلہ ہے کہ انہوں نے کبھی چند استثنائی مثالوں کے سوا کسی ایسی تحریک کا ساتھ نہیں دیا جو اخلاق کی دنیا بدلنے اور دنیا پرستی کی جگہ خدا پرستی قائم کرنے کی علمبردار ہو۔

اس مرتبہ ہمیں یہ گزارشات اس لیے پیش کرنی پڑیں کہ ہمارے رفقا اجتماعی نفسیات کے تجربوں سے واقف ہوں اور وہ خواہ مخواہ اپنی توقعات اُن گروہوں سے وابستہ نہ کر لیں جو کبھی ہمارا ساتھ نہیں دے سکتے۔

ہم نے دیکھا ہے کہ اس حقیقت کو نگاہ میں نہ رکھنے کی وجہ سے بسا اوقات ان کے دلوں پر عجیب و غریب کیفیات طاری ہونے لگتی ہیں۔ میں یہاں اس کی ایک مثال پیش کرتا ہوں بعض رفقاء سے جب جماعت اسلامی کی رفتار کار کا ذکر کرتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ انہیں اس بات سے بڑی فکر لاحق ہے کہ جماعت میں نامور علماء، معروف پروفیسر، مشہور صحافی، نمایاں اہل علم اور بڑے سیاسی لیڈر کیوں نہیں آ رہے ہیں اور آنے والوں میں زیادہ تعداد متوسط طبقے کے غیر معروف افراد کی ہے۔ جماعت کے ہمدرد اس موضوع پر اخلاص کی بنا پر غور کرتے ہیں لیکن مخالفین اسے جماعت اسلامی کی ناکامی کی بہت بڑی دلیل سمجھتے ہیں۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ سارا کھیل ایک شخص کی ذہانت اور قوتِ استدلال کی وجہ سے کھیلا جا رہا ہے ورنہ درحقیقت اس تحریک کا شیرازہ منتشر ہو چکا ہے۔ نامور مذہبی شخصیتیں اس سے الگ ہیں، مشہور اہلِ علم اس کے مخالف ہیں اور اس میں شامل ہونے والے نیم خواندہ اور نچلے طبقے کے لوگ ہیں۔ خدا گواہ ہے کہ میں جب ان لوگوں کے یہ طعنے اور اندیشے سنتا ہوں تو مجھے اس امر کا یقین ہو جاتا ہے کہ ہم صحیح راہ پر گامزن ہیں۔ اگر ہم مفادات کے بُت توڑنے کے لیے نہ اُٹھتے تو مفاد پرست، اقتدار پرست اور انانیت پرست ہمارا ساتھ دیتے۔ لیکن آخر ان حالات میں جبکہ ہم ہر قسم کے غلط مفادات کے خلاف صف آرا ہیں تو یہ طبقے ہمارا کس طرح ساتھ دے سکتے ہیں۔ وہ لوگ جن کی قیادت و سیادت مروجہ اقدار سے، خواہ وہ سیاسی ہوں، یا مذہبی یا معاشرتی، وابستہ ہے وہ کیونکر کسی ایسی تحریک کے ساتھ دل و جان سے وابستہ ہو سکتے ہیں جو اجتماعی زندگی کے پورے ڈھانچے کو بدلنے کا عزم رکھتی ہے۔ آدمی تو اپنے کسی جھونپڑے کو چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوتا، مفادات کے اُن رفیع الشان محلات اور ایوانوں کو آخر کس طرح چھوڑ سکتا ہے جو انہوں نے بڑی آرزوؤں اور تمناؤں اور غیر معمولی مشقت کے ساتھ تعمیر کیے ہیں۔ اس لیے بالکل فطری طور پر ہماری دعوت پر وہی لوگ لبیک کہیں گے جنہیں یا تو دعوتِ حق دنیا کی ہر چیز سے، اقتدار سے، مال و دولت سے، معاشرتی اثر و رسوخ سے زیادہ عزیز ہے یا وہ لوگ ہمارے شریک کار ہونگے جن کی نہ تو کوئی انا ہے اور نہ کوئی مخصوص مفاد۔ مذہب کی زبان میں انہیں لوگوں کو مسکین کہا جاتا ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ ہمارے ساتھ جو رفقاء شامل ہو رہے ہیں اور یہ جس طبقے سے کھچے چلے آ رہے ہیں انہیں دیکھ کر تو دل کو پورا اطمینان نصیب ہوتا ہے کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے دینی دعوت کے تقاضوں کے عین مطابق ہو رہا ہے۔ (باقی ص ۶۳ پر)

کتاب سفید کاغذ پر نہایت اچھے طباعتی معیار پر شائع ہوئی ہے۔

(بقیہ اشارات)

البتہ ہمیں پریشانی اُس وقت ہوتی جب خدانخواستہ ہم یہ دیکھتے کہ مفاد پرست اپنے مفادات کے پُشتارں اور انا پرست اپنی انانیت کے بوجھ لیے ہوئے جماعت کی طرف کھنچنے لگتے۔ اس صورت میں بلاشبہ ہمیں اپنے حق پر ہونے میں شک لاحق ہو جاتا، اور ہمیں یقین ہے کہ اس صورت میں اس تحریک کو بھی سخت نقصان پہنچتا۔ مفادات کے بندے اور انا کے پرستار جتنے بڑے مقام اور مرتبے کے مالک ہوں اسی نسبت سے وہ دینی تحریک کے لیے مُضر ثابت ہوتے ہیں۔ اپنی شخصیت کی غیر معمولی اہمیت کا احساس، اپنی قابلیت کا غرور اور معاشرے میں اپنے وسیع اثر و رسُوخ کا گھمنڈ انہیں کبھی اس بات کی اجازت نہ دیتا کہ وہ جماعت کے غریب ساتھیوں کو، جو درحقیقت کسی تحریک کی جان ہوتے ہیں، درخور اعتنا سمجھیں۔ یہ صورتِ حال جب بھی پیش آتی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جماعت کے نہایت مخلص مگر دنیاوی جاہ و جلال کے اعتبار سے کمزور ساتھی دل شکستہ ہو کر بیٹھ جاتے ہیں، اور اُبھر کر وہ لوگ آتے ہیں جو مقصدِ حق کی بہ نسبت اپنے "آپ" کو عزیز تر رکھنے والے ہوتے ہیں۔

اسلام اینڈ ماڈرن ازم (انگلش)

از

مریم جمیلہ

دوسرا اضافہ شدہ ایڈیشن ـ قیمت ـ/ ۹ روپیہ

۲۶۸ صفحات ۔ اعلیٰ طباعت ـ خوبصورت جلد۔

ملنے کا پتہ: (۱) محمد یوسف خاں سنت نگر، لاہور

(۲) مکتبہ لیہ سفیہ ۔ اکرم مینشن نیلا گنبد، لاہور